© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد ریاض

پندرھویں صدی ہجری میں جمالیاتی احساس

اور

اخلاقی ردّ و قبول

(دوسری اور آخری قسط)

اخلاق اور اس کا فلسفہ

اخلاق کے دو طرح کے اصول ہمیں نظر آتے ہیں: ایک وہ جو انسانی عقل نے پسند و ناپسند اور تجربہ و احساس کی بنا پر وضع کیے اور دوسرے وہ جو ہدایت آسمانی یعنی وحی الٰہی نے انسانوں کی راہنمائی کی خاطر انبیائے کرام کے توسط سے بیان کیے ہیں۔ اس وقت الہامی اخلاق کی صحیح تعلیمات کا سرچشمہ قرآن مجید ہے یا اس کی شارح صحیح احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ بات ہم اس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام کے علاوہ دیگر الہامی ادیان کی تعلیمات بڑی حد تک مسخ و محرّف ہو چکی ہیں۔ رہی اخلاقیات کی فلسفیانہ تعلیمات، تو الہامی ہدایات کے مقابلے میں ان کی حیثیت کو نہ اعتبار و اعتماد حاصل ہے نہ استقرار و ابدیت، کیوں کہ فلسفۂ اخلاق واضح اہداف و مقاصد سے عاری نظر آتا ہے۔ البتہ اس میں مدعیانِ اخلاق کی پسند و ناپسند اور ردّ و قبول کی باتیں ضرور مل جاتی ہیں۔

اسلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ تعلیماتِ وحی کا محفوظ خزانہ اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ انسانِ کامل اور انسانوں کے لیے نمونۂ تقلید حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس لیے بھی ممتاز ہے کہ آپ نے اخلاق کی تعلیم ہی نہیں دی، اس تعلیم پر تمام و کمال طریقے سے عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔ تاہم اسلام کے نظامِ اخلاق کی اساسی باتیں دیکھنے سے قبل یہاں عام فلسفۂ اخلاق پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ کیوں کہ خود مسلمانوں نے ایسی اخلاقی بحثیں پیش کی ہیں جن میں دین اور فلسفہ مرتبط اور ممزوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ متکلمینِ اسلام نے معرفتِ خداوندی اور عملی علمِ اخلاق کے تین طریقے بتائے ہیں۔ حسّی و تجربی، خبری و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینی اور نظری و استدلالی۔ پہلے طریقے، حسی و تجربی کی رو سے حسن و قبح اور خوب و ناخوب کی جمالیاتی بحثیں ہوتی رہیں اور عقلا، اپنے محسوسات اور تجربات سے عام لوگوں کو بہرہ مند کرتے رہے۔ خبری و دینی طریقے کی وضاحت ضروری نہیں اور اس کی طرف ہم اسلام کے اخلاقی نقطۂ نظر کے بیان میں اشارہ کریں گے۔ تیسری روش، یعنی نظری و استدلالی کو فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر قدیم حکمائے یونان سے تا ایں دم فلاسفہ و حکما میں مقبول رہا اور مسلمان دانش مند اسے اسلامی تعلیمات سے مربوط کرتے رہے ہیں۔ مسلمان متکلمین کی کتابوں میں سقراط، بقراط، جالینوس، افلاطون اور ارسطو وغیرہم کے اخلاقی افکار اور عقاید بڑے تواتر سے نقل ہوتے رہے اور کہیں کہیں ان کا ردّ و قدح بھی ہوا۔ علم کلام کے ان مباحث سے اسلامی مدنیت کو فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ مثلاً اخلاقی فضائل و رذائل کی بحث مسلمانوں کی کتابوں، خصوصاً فارسی کتب میں یونان کے مباحث اخلاق کے زیر اثر وارد ہوئی اور مسلمانوں نے ان افکار میں نئی باتیں بھی شامل کی ہیں۔ مثلاً رذائت کا تصور جس کا مقصود یہ ہے کہ کوئی اخلاقی فضیلت بھی جب حد اعتدال سے بڑھ جائے، تو وہ فضیلت نہیں رہتی بلکہ رذائت کے حکم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ارسطو نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں بعض معاشرتی مباحث چھیڑے تھے۔ مثلاً یہ کہ معاشرے کے ارکان تین ہیں: آبادی، معاشرتی قانون اور افراد معاشرہ کا تعاون (فرد اور جماعت کا تعلق)۔ مسلمانوں نے ان مباحث کو اپنے نقطۂ نظر کا ترجمان بنا لیا۔ یونانی فلسفۂ اخلاق کے کئی باحثی تصورات اب بھی بحث طلب ہیں مثلاً یہ تصور کہ اصول اخلاق کے ضمن میں فرد کا نقطۂ نظر دیکھا جائے یا ملک و معاشرے کا مفاد؟ یا یہ بات کہ روش اخلاق اپنانا اور نیک کام انجام دینا ایک طبعی امر ہے یا اکتسابی؟ چند دوسرے مباحث حسب ذیل ہیں:

(۱) سعادت اور شقاوت کیا ہیں اور نظام اخلاق سے ان کا کیا تعلق ہے؟ (۲) انسان اچھے برے کام کرنے پر از روئے جبلّت آزاد ہے یا مجبور؟ (۳) حسن و قبیح اور خوب و ناخوب کے پیمانے کون سے ہیں؟

فلسفۂ اخلاق کے اس قسم کے سارے مباحث آج تک مغرب و مشرق میں جاری ہیں۔ یورپ کے کئی نظام ہائے فکر، اخلاق سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں اور مذہب و دین کے نقطۂ نظر سے بے اخلاقی کے کاموں کو وہ اخلاق کا نام دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اباحی نقطۂ نظر میں خیر و شر اور خوب و ناخوب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا کوئی واضح تصور ہی نہیں، کسی کام کے مقاصد محرک قوت کا کام دیتے ہیں مگر یہاں وہ بھی مفقود ہیں۔ پس جہاں جزا و سزا اور گناہ و ثواب یا حلال و حرام کا تصور نہ ہو، وہاں حسنِ اخلاق کیا پنپے گا ــــ؟ دوسری طرف بعض نظام ہائے افکار میں گوسفندی و سربزیری والا اخلاق ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کے افراطی یا تفریطی افکار اخلاق، اپنے ذوق کے متعلق، بعض مسلمان گروہ بھی اپناتے رہے مگر یہ اسلامی تعلیمات کی تحریف اور غلط تعبیرات ہیں۔ صحیح اسلامی اخلاق وہ ہے جو قرآنِ مجید اور احادیثِ رسول کی تعلیمات سے مستفاد ہو اور اس میں نہ افراط ہو سکتی ہے نہ تفریط، کیوں کہ اسلام فرد اور معاشرے دونوں کے فوائد کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور مدنیت اسلام، اس طرح ذیل کے اشعار کا مصداق بنتی ہے:

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اخلاق، اسلام کی رو سے

جیسا کہ اس سے قبل سعید حلیم پاشا کے مقالے کے ذکر میں کہا گیا، اسلام کا تصورِ اخلاق بہت جامع اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس نظامِ اخلاق کو کسی فلسفیانہ سہارے کی ضرورت نہ تھی مگر مسلمان فلسفی اپنے ذوق کے مطابق ایسا کرتے رہے ہیں۔ رسائل اخوان الصفا[1] نیز ابو نصر فارابی (وفات ۳۳۹ھ)، ابن مسکویہ (وفات ۴۲۱ھ) اور بو علی سینا (وفات ۴۲۸ھ) کی کئی کتابوں میں یہی روش نظر آتی ہے اور فارسی کتبِ اخلاق کا اسلوب بالعموم یہی ہے کہ فلاسفائے اخلاق سے استناد ہو اور تعلیمات اسلام سے بھی، مگر متکلمینِ اسلام کے جس دوسرے طریقے تلقینِ اخلاق کا ہم نے خبری و دینی عنوان سے ذکر کیا تھا، اس میں صریحاً اسلام کی اخلاقی تعلیمات بھی بیان کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی متکلمینِ اسلام میں ایسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے اپنی دینی معلومات کی روشنی میں اوامر و نواہی، خیر و شر اور نیک و بد امور کی مفصل بحثیں کی ہیں، ایسے بزرگوں میں امام محمد غزالی (وفات ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) بہت نمایاں ہیں جن کی عظیم تالیف احیاء علوم الدین کی جلد ثالث

---

[1] چوتھی صدی ہجری کے کوئی ۵۲ رسالے دیکھیں۔ رسالہ رجحان کراچی بابت اپریل ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر سید حسین نصر کے مقالے کا ترجمہ از ڈاکٹر جمیلہ خاتون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قسم کے مباحث کے سلسلے میں مخصوص ہے۔ مگر استدلالی بحثوں سے اعتنا کرنے والے متکلمین نے عقائد و عبادات اور اعمال اسلامی کی عقلی بنیادیں فراہم کی ہیں اور یہ بھی ایک خدمت ہے۔ دوسری طرف صوفیا نے سلوک و عرفان اور احوال و مقامات کے ذکر میں اسلامی تعلیمات کی اخلاق آموز توجیہات پیش کی ہیں۔

اسلام کے نظامِ اخلاق کے معین اصول ہیں اور یہ انفرادی و اجتماعی حقوق و فرائض پر مبنی ہیں۔ یہاں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز ہے۔ انسانی ذوق کو البتہ تمام دل پذیر جولانیاں میسر ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ حدود اللہ سے متصادم نہ ہو۔

لفظ خَلق (تخلیق) اور خُلق (اخلاق کا مفرد) کا عربی میں ایک ہی مادہ (ROOT) ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اخلاق کو اسلام میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرتؐ کے اخلاقِ فاضلہ کو خلقِ عظیم قرار دیا گیا ہے: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم، ۴) ان کا خلق عظیم ہی اسلامی اخلاق کا نمونۂ کامل کہا جائے گا۔ قرآن نے ہمیں یہ نکتہ بھی بتایا ہے کہ صحبتِ اخیار سے اخلاق سنورتے ہیں۔ یہ عظیم کتاب عجیب متوازن اصولِ اخلاق سکھاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ خدائی رنگ اختیار کرو یعنی خدا کے فیاضانہ اخلاق اپناؤ۔ ایک حدیث بھی ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ۔ اسلام جذبات کی تعدیل کرتا ہے نہ کہ ان کا استیصال۔ مثلاً غصے کو ضبط کرنے کی تلقین ہے۔ اس کو مٹا ڈالنے کی نہیں کیونکہ اس جذبے کا تہور و غیرت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے: اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا (شمائل ترمذی)۔ آنحضرتؐ نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق بتایا ہے کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق و محاسن الاعمال۔ اسلام نے اعمال کی بنیاد اخلاق اور نیت پر رکھی تاکہ منافقت اور دو دوئی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی جائے۔ حدیثِ قدسی ہے: انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری)۔ اس دین میں نفاق اور تظاہر بے حد معیوب ہیں۔ خدا نے نیکی و احسان کر کے اس کے تذکرے کرتے رہنے کو کم ظرفی قرار دیا کیونکہ نیکی و احسان جتلانے کے عمل سے نیکیوں کا ابطال ہو سکتا ہے۔ اسلام حلال غذاؤں کی ہی تاکید نہیں کرتا بلکہ حلال کمائی کی بھی تاکید کرتا ہے۔ فرد کی یہی ذمے داری نہیں کہ وہ خود نیک ہو، اپنے اہلِ خانہ اور معاشرے کی اصلاح کی حتی المقدور کوشش کرنا بھی اس کا فریضہ ہے۔ اسلام کی رو سے انسان پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں۔ کسی دوسرے نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کیا اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ انسان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نفوس انسانی میں سے کوئی امارہ سے دوچار ہیں کوئی لوامہ سے۔ امّارۃ بالسوء یعنی برائی کا حکم دینے والا اور لوامہ یعنی ملامت کرنے والا۔ خاصانِ خدا کے نفوس مطمئنہ ہیں یا لوامہ (توبہ) کی منزل سے گزرنے والے۔ کفر و شرک کے گناہ کا علاج یہ ہے کہ از سرِ نو اسلام میں داخل ہوا جائے۔ باقی گناہ سچی توبہ و انابت سے معاف ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں کبائر اور صغائر کی مفصل بحث ہے۔ باقی اخلاقی تعلیمات کا کلیدی نکتہ یہ ہے کہ اسلام اخلاق کا انفعالی نقطۂ نظر پیش نہیں کرتا کہ لوگ فقر و مسکنت، بے جا ضعف و انکساری اور جسمانی اور روحانی انحطاط کو محبوب جاننے لگیں۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث رسولؐ ہے کہ: المومن القوی خیر واحب الی اللہ من المومن الضعیف۔ یعنی اللہ کے ہاں کمزور مومن سے قوی مومن زیادہ محترم و مکرم ہے۔ اسلام کی تعلیم کی سی معتدل، متوازن اور عمل پذیر اخلاقی تعلیم آج کون سا دوسرا دین یا نظامِ فکر پیش کر سکتا ہے؟ اہلِ مغرب میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ مذہب کے سہارے نہیں تو اخلاق کے سہارے جی رہے ہیں اور شرافت مندانہ زندگی گزار رہے ہیں، مگر مغربی زندگی کا دھارا اب سبھی جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت حسنِ اخلاق کی احسن تعلیمات سیرتِ انبیا کے ذریعے ہی مل سکتی ہیں اور دینِ اسلام ہی ایسی سب تعلیمات کا وارث و امین ہے۔ مسلمانوں نے اخلاقی تعلیمات مرتب کرنے میں بڑی محنت اور جمالیاتی احساس کا ثبوت دیا ہے، خصوصاً فارسی زبان میں۔ جیسے حسن و دل[۱۳] فتاحی کی ان کتابوں میں اخلاق کا اجتماعی رنگ بھی نمایاں ہے۔ مغربی فلسفۂ اخلاق کی بے راہ روی کے مقابلے میں مسلمانوں کا اجتماعی تاثر کتنا ولولہ انگیز ہے مغربی فلسفیوں کا یہ عالم ہے کہ مثلاً دمورہ، نیکی کی تعریف پیش نہیں کر سکا ہے نہ اخلاق کی۔ اسپینوزا (م ۱۶۷۷ء) ایک نامور لاادری اور فکری آزادی کا فلسفی ہے مگر اس نے جمالیاتی احساس اور اخلاقی ردّ و قبول کی کوئی دل پذیر بات کم ہی کی ہے[۱۴]

اجتماعی اخلاق کی صورتیں

مسلمانوں کی تاریخ اجتماعی اخلاق کی مختلف صورتوں کی مظہر ہے۔ قرآنِ مجید نے مسلمانوں کو بھائی

---

۱۳ دیکھیں اس کتاب کا راقم کا ترجمہ سہ ماہی "اردو" کراچی بابت اپریل ۱۹۸۰ء میں

۱۴ مجلہ پیامی کراچی ستمبر ۱۹۷۷ء میں مقالہ: اسپینوزا۔ نیز ردبنر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھائی قرار دیا اور اُمتِ مسلمہ کو تلقین کی کہ اگر ان بھائیوں کے درمیان کوئی اختلاف اور نزاع برپا ہو تو اسے صلح و آشتی میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس تعلیم کے نتیجے میں چشمِ فلک نے غالباً پہلی بار مہاجرین اور انصار کا ایثار اور فداکاری کے امور پر مبنی سلسلۂ مواخات دیکھا۔ تاریخ اسلام میں تعاون علی البر اور ایک دوسرے کی مدد کے جذبے سے سرشار کئی تحریکیں اٹھتی رہیں مگر جوان مردی یا فتوت ان سب میں عظیم تر نظر آتی ہے۔ اسے آئینِ جواں مردی یا کئی دوسرے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ عربی اور فارسی فتوت نامے اس تحریک کی تفصیلات بہم پہنچاتے ہیں۔ تصوف کے بعد دوسرا موثر نظامِ فکر و عمل ان ہی فتیان یا جواں مردوں کا تھا جس نے بے کسوں کو سہارا دیا، ظالموں سے ٹکر لی اور اسلام کی پرشکوہ اخلاقی تعلیم کو عملی صورت میں جاری و ساری رکھا۔

اخلاق اور جمالیاتی احساس کا رابطہ

جمالیات یا جمالیاتی احساس اور اخلاق کا بڑا گہرا رابطہ ہے۔ تخلیق کار، ہنرمند اور منکرِ اظہاریت پر مجبور رہیں مگر نظامِ اخلاق، خواہ وہ کسی دینِ فکر کے تابع ہو یا آزاد، افکار و تخلیقات کے حسن و قبح کا حکم لگا سکتا ہے۔ یعنی ایک پیمانہ وہ ہے جس سے جمالیات شناس حسن کا استحسان کرتے ہیں اور دوسرا پیمانہ وہ ہے جس سے نظامِ اخلاق حسن کے استحسان کی پرکھ کرتا ہے۔ یہ اخلاقی پرکھ کسی فن کے نقادوں کی پرکھ سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں آرزوئے اخلاق خیر و شر اور حسن و قبح کا حکم لگایا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام ہی نہیں، تاریخِ عالم بھی گواہ ہے کہ اخلاقی رد و قبول سے یا ان کے بہانے سے کئی فن کار وطنِ عزیز اور کئی جان عزیز سے ہاتھ دھوتے رہے اور کئی لوگوں نے قید و بند کی صعوبتوں میں زندگیاں گزاریں یا گزار رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟۔ دراصل نظریات بھی مدتوں سے ادیان کی طرح مقدس رہے ہیں اور یہی حال مختلف سیاسی نظاموں کا ہے۔ اس لیے جمالیاتی احساس اور نظام ہائے اخلاق میں کہیں اتفاق ہوگا اور کہیں کم یا زیادہ اختلاف اور ایسا ہونا فطری بات ہے۔ خالقِ کائنات نے جمادات، نباتات، حیوانات اور عالمِ انسانی میں تنوع کا اصول رکھا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اذواق اور ان کے استعداد میں بھی تفاوت واقع رہے، جس کے نتیجے میں انسانی فعالیتوں کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ اس وقت میں نے عبدالرحیم کی کتاب علم اخلاق پر جو نظر ڈالی، تو اس میں اخلاقی مباحث بڑے گوناگوں نظر آئے۔ جیسے اخلاق اور عمرانیات، اخلاق اور قانون، نظری اخلاق، عملی اخلاق، معاشرتی اخلاق اور مدنی و سیاسی اخلاق۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرتی اخلاق کے عنوان سے مصنف تعاونِ باہمی پر زور دیتا ہے جسے ہم نے اوپر فتوت یا جواں مردی قرار دیا ہے۔ نظریِ اخلاق کے ذکر میں مصنف لکھتا ہے کہ جمالیاتی احساس کو اس حد تک پہنچنے دینا چاہیے کہ معاشرتی اخلاق یعنی نظامِ زندگی اس سے مختل نہ ہونے لگے۔ گویا اخلاق کو جمالیاتی احساس پر نظارت کرنا چاہیے۔ مصنف آزادی کی مختلف صورتوں کے ذکر میں لکھتا ہے:

"ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ حقیقت کی جستجو کرے اور جسے وہ حقیقت جانے، اس کا معتقد بنے۔ لیکن کسی ایک شخص کے افکار و عقائد کی آزادی کا دوسرے کی آزادیِ فکر پر برا اثر نہیں پڑنا چاہیے، کیوں کہ جس طرح ایک شخص کو اپنے عقائد عزیز ہیں، ایسا ہی دوسرے کو بھی ہیں اور اپنے ذوق کی پسند دیکھتے وقت دوسروں کے ذوق کی ناپسند کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، لیکن اس قسم کے اختلافات اس معاشرے میں جنم لیتے ہیں جہاں خیر و شر کی قوتوں میں نزاع ہو۔ اگر خیر کا دور دورہ ہو تو پھر ان نزاکتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ علامہ اقبال کے نظامِ اخلاق پر ایک مضمون کو کتاب بنا دیا گیا ہے۔ اس میں اسلامی نظامِ اخلاق کی مبادیات موجود ہیں۔ ان کے ایک انگریزی خطبے میں آزادی اور قوتِ خیر کا ذکر یوں ملتا ہے:

"در اصل خیر میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر کا مطلب ہے انسان کا برضا و رغبت کسی اخلاقی نصب العین کی پیروی کرنا۔ . . آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے"[۵۴]

بہرحال، جمالیاتی احساس اور اخلاق کا بڑا گہرا رابطہ ہے مگر مغرب اور مشرق خصوصاً مسلمانوں اور دوسروں کے جمالیاتی احساس اور اخلاقی اصولوں میں جو فرق اس وقت ہے، پندرھویں صدی ہجری میں وہ شاید کم نہ ہو سکے گا۔ در اصل مغربی ممالک اپنی مادی ترقی کے نشے میں اس قدر سرشار ہیں کہ انھیں مسلمانوں سے کوئی اعتنا ہے نہ اسلام سے۔ مگر غیر مسلم اقوام بھی بالعموم دینی نقطۂ نگاہ کی جستجو میں ہیں کہ اسلام کے پیغام سے آگاہ ہوں۔ دوسری طرف مسلمان اگرچہ اپنے دین کی عالمی پیمانے پر نشر و اشاعت کے لیے اس قدر کوشاں نہیں جس قدر اس کام کا حق ہے مگر عملاً وہ بالعموم اقبال کے اس شعر پر عامل نظر آتے ہیں کہ:

---

[۵۴] تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۱۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حریم دیں میں ہو　　ملک و ملّت ہے فقط حفظ حرم کا اک شعر

غرض پندرھویں صدی ہجری میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دامنِ دین کو مضبوطی سے پکڑیں گے مگر دیگر اقوام کے سیکولر اور لادین نقطۂ نظر میں شاید مزید شدت آتی جائے۔ الاماشاء اللہ۔ پس جہاں یہ بات بہت غنیمت ہے کہ مسلمان ایک بار پھر دین سے تمسک کرنے لگے ہیں۔ وہاں یہ بات لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں کی معاشرتی تقلید سے دور رہنا چاہیے۔ غیر مسلموں کے جمالیاتی احساسات اور اخلاقی ردّ و قبول ان کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہو سکتے۔ یہاں اس نکتے پر پھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ دین فطرت، اسلام میں شرافت مندانہ لذت گیری، جمالیاتی استحسان اور انسانیت کی تعمیر کرنے والے جملہ اخلاقی امور کی گنجائش بلکہ تشویق موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام نے زندگی کے جملہ آداب و سنن کے سلسلے میں اپنے اصول ردّ و قبول پیش کیے ہیں۔ انسانی فکر کے ارتقا کے لیے اسلام میں ساری سہولتیں اور گنجائشیں موجود ہیں۔ وحی الٰہی کے انوار کو سامنے رکھے، تو فکرِ انسانی گمراہ نہ ہوگی۔

مناسب ہوگا کہ یہاں موضوع زیرِ بحث کی توضیح کی خاطر ہم علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم کا ایک اقتباس نقل کر دیں۔ سید موصوف اخلاق اور نفسیات کا رابطہ بتاتے ہیں اور رواقیہ یا ضمیریہ نیز لذتیہ یا افادیہ نام کے فلسفۂ اخلاق کے نظاموں کا ذکر کرتے ہیں۔ جمالیاتی احساس اور اخلاقی پسند و ناپسند کا مسئلہ بڑی حد تک افادیہ یا لذتیہ طریقِ اخلاق سے مربوط ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دینا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتہً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں۔ ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں۔ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ہے خدا اور اس کی رضامندی کا حصول۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد، خوشی اور رنج یا روحانی لذت و الم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض و غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں۔ اسی نکتے کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۔ (حجرات : ۷)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کرکے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگا دی۔ یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اس آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی: اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك فهو مومن۔ من سرته حسنته وساءته سيئته فهو مومن۔ من عمل سيئة فكرهها حين يعمل وعمل حسنةً فسر فهو مومن۔

یعنی تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو۔ جس کو نیکی خوش اور برائی غم زدہ بنائے، وہ مومن ہے۔ جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت ہوئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی، وہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراح خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

جمالیاتی احساس اور اخلاقی ردّ و قبول کا مالہ اور ما علیہ گزشتہ سطور کے مختصر مباحث سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے، خصوصاً اسلام کے نقطۂ نظر سے۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی خوب و ناخوب معلوم ہو سکتا ہے اور مستقبل کی پیش بینی اور آئندہ اعصار و دہور کے متوقع تقاضے بھی اسی کتابِ عظیم کے ذریعے معلوم ہو سکتے ہیں۔ پس مسلمانوں کی سی خوش قسمت قوم کو، جن کے پاس قرآنِ مجید ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندہ و تابندہ کتاب ہے، اخلاقی رد و قبول اور جمالیاتی احساس کے مالہ و ماعلیہ کو دیکھنے کے لیے کسی اور مرجع کی ضرورت نہیں مگر یہ کہ مقصود تقابلی مطالعہ ہو۔

حاصل بحث

جمالیاتی احساس، انسانی احساسات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جمالیات ایک مفید علم ہے جس کا تعلق فلسفہ اور نفسیات سے ہی نہیں، ثقافت اور اس کے جملہ شعبے جیسے ادبیات اور فنونِ لطیفہ وغیرہ سب اس سے مربوط ہیں خصوصاً اخلاقی نقطۂ نگاہ دیکھنے کی خاطر۔ جمالیاتی احساس اور اخلاق کے نظریات قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ یورپ میں مدتوں سے دین و سیاست جدا ہیں اور اباحی اور سیکولر نظریات کا چلن زوروں پر ہے۔ مگر اقوامِ مغرب اور دوسرے لادین نظریات کے حامل لوگ اپنے طریقۂ فکر و عمل سے مطمئن نہیں۔ مسلمان بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس ابدی نوعیت کی جامع اسلامی تعلیمات موجود ہیں جو یورپ کے جمالیاتی، اخلاقی یا دوسرے نظریات کی طرح تغیر پذیر نہیں بلکہ فطرتِ الٰہی کی طرح مثبت اور اٹل ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر قسم کی ترقی ممکن ہے۔ اگر ہم ارکان و اساطینِ اسلام پر غور کریں جن پر اس دین کی عظیم عمارت تعمیر ہے تو جمالیاتی احساس اور اخلاقی پسند و ناپسند ایسے امور اس عظیم عمارت کے نقش و نگار معلوم ہوں گے۔ ان نقش و نگار کو اس طرح ہونا چاہیے کہ عمارت کے جمال و جلال کے ساتھ مطابقت رکھیں۔ مسلمان ترقی یافتہ اقوام کے علوم و فنون اپناتے رہیں گے مگر اپنے دین کے مزاج کی حد تک۔ دوسروں کی غیر مشروط تقلید نے مسلمانوں کو نہ پہلے فائدہ دیا نہ اب دے گا۔ پندرھویں صدی ہجری نفاذِ اسلام کی صدی ہے لہٰذا مسلمانوں کا جمالیاتی احساس اور اخلاقی رد و قبول، تعلیماتِ اسلام کے تابع ہو گا۔

۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۸۱ء کو ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ نے "سیرتِ نبوی کا پیغام عصرِ حاضر کے نام" کے عنوان سے جو مقالہ پڑھا اور جسے وفاقی وزارتِ مذہبی امور اسلام آباد نے شائع بھی کروا دیا، اس کے اقتباس پر اس مختصر بحث کو ختم کیا جا رہا ہے:

"یہ امرِ واقعہ ہے کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی تک پہنچ چکا ہے لیکن ان عظیم الشان ترقیات کے باوجود جیسا کہ ان کے ادب اور فکری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، وہاں کے افراد سخت بے اطمینانی میں مبتلا ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بنیادی تصورات کسی خاص قسم کے عدمِ توازن کا شکار ہو چکے ہیں اور انھیں واقعی کسی ایسے پیغام کی ضرورت ہے جس سے ان کے معاشرے کا توازن بحال ہو جائے اور ہمارا یقین یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ وہ پیغام رحمت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات، قرآنِ مجید اور سیرت نبویہ میں موجود ہے ۔ ۔ ۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مغرب، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ناقابلِ یقین کمال تک پہنچ چکا ہے تو اس صورت میں مغرب کو کسی بیرونی پیغام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ دعویٰ مغرب کے اکثر مفکر کرتے بھی ہیں لیکن خود مغربی ادب یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان سب مذکورہ ترقیات کے باوجود مغرب قلبی اطمینان سے محروم ہے اور امریکہ و یورپ کے معاشروں میں کج روی اور بے یقینی کے بحران بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پریشانیوں کا موجب ہیں، اس لیے پیغام اور رہنمائی کی ضرورت واضح ہے۔ ضمیر دار اہلِ فکر کو محسوس ہوا کہ انسان ایک نہایت ہی وسیع دنیا ہے۔ اس کے داخلی قلبی دکھوں کا علاج سائنس کے پاس نہیں تو مایوسی پھیلنے لگی۔ جان و تن کی تفریق بڑھتی گئی اور دل پژمردہ ہوتے گئے۔ اب قریب ہو کر آپ دلوں کو ٹٹولیں گے تو اکثر مغربی لوگ اندر سے دکھی نظر آئیں گے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء کا مغربی ادب اس کرب و اضطراب کا آئینہ دار ہے۔ معاشرتی اور تخلیقی ادب کے آئینے میں یہ تصویر دیکھنی ہو تو ہارورڈ کے پروفیسر T.W. BELL کی کتاب (CULTURAL CONTRADICTIONS OF CAPITALISM تھیا بالڈ کی کتاب RELIGION AND MAGEA اور BEYOND DESPAIR کی کتاب THE MODERN MIND کے اوراق پر نظر ڈالیے اور خود دیکھ لیجیے کہ پریشانی، کج روی اور تخریبی احساس کس خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے ۔ ۔ ۔ خدا کا سہارا ختم کر دیا اور تن کی خواہشات کی تسکین اور عیش امروز ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ ایمان باللہ اور ایمانیات سے انکار نیز دین اور دنیا کی جدائی مغرب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بنیادی پیغام مغرب (عصرِ حاضر) کے نام عود الی الایمان (RETURN TO FAITH) ہے۔"[۵۵]

---

۵۵ سیرت نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام مطبوعہ برق سنز اسلام آباد صفحات بالترتیب ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ اور ۱۴

© rasailojaraid.com